آرا و افکار

مولانا مفتی محمد زاہد*

موجودہ پرتشدد تحریکیں اور دیوبندی فکر و مزاج

گزشتہ دنوں بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر اس کے ایک نامہ نگار کا ایک شذرہ شائع ہوا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے اپنی بات کا آغاز اسی کو نقل کرنے سے کیا جائے:

''بائیس اور تئیس مئی کے دو روز میں نے اتر پردیش کے قصبے دیوبند میں گزارے، وہی دیوبند جس نے گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں ہزاروں جید سنی علماء پیدا کیے، جن کے لاکھوں شاگرد برصغیر اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آج بھی دارالعلوم دیوبند سے ہر سال چودہ سو کے لگ بھگ طلباء عالم بن کر نکل رہے ہیں۔ دیوبند، جس کی ایک لاکھ سے زائد آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ساٹھ فیصد ہے، وہاں پہنچنے سے قبل میرا تصور یہ تھا کہ یہ بڑا خشک سا قصبہ ہوگا جہاں علماء کی آمریت ہوگی اور ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ علاقے کی مسلم آبادی کے لیے حکمِ مطلق کا درجہ رکھتا ہوگا، جہاں موسیقی سے متعلق گفتگو تک حرام ہوگی، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو دور دور سے پرنام کرتے گزرتے ہوں گے، وہاں کسی کو جرات تک نہیں ہوگی کہ بغیر داڑھی کے یا ٹخنوں سے اونچی شلوار کے بغیر بلا سرزنش آباد رہ سکے۔ دیوبند میں مسلمان محلوں میں اذان کی آواز بلند ہوتے ہی دوکانوں کے شٹر گر جاتے ہوں گے اور سفید ٹوپی، کرتے پاجامے میں ملبوس باریش نوجوان چھڑی گھماتے ہوئے نظر رکھ رہے ہوں گے کہ کون مسجد کی جانب نہیں جا رہا۔ اسی لیے جب میں نے کچھ سفید باریش نوجوانوں کو دارالعلوم کے قریب ایک حجام کی دوکان پر اطمینان سے اخبار پڑھتے ہوئے دیکھا تو فلیش بیک مجھے اس ملبے کے ڈھیر کی جانب لے گیا جو کبھی حجام کی دکان ہوا کرتا تھا۔ جب میں نے ٹوپیاں فروخت کرنے والے ایک دکان دار کے برابر ایک میوزک شاپ کو دیکھا جس میں بالی وڈ، مصالحہ اور علمائے کرام کی تقاریر پر مبنی سی ڈیز اور کیسٹیں ساتھ ساتھ بک رہے تھے تو میرا دماغ اس منظر میں اٹک گیا جس میں سی ڈیز اور کیسٹوں کے ڈھیر پر پٹرول چھڑکا جا رہا ہے۔ جب میں نے بچیوں کو ٹیڑھی ٹیڑھی گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے اسکول کی جانب رواں دیکھا تو دل نے پوچھا یہاں لڑکیوں کے اسکولوں میں کسی کو بم فٹ کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ جب میں نے برقعہ پوش خواتین کو سائیکل رکشے میں جاتے دیکھا تو لاشعور نے پوچھا یہاں محرم کے بغیر خواتین بازار میں آخر کیسے گھوم پھر سکتی ہیں؟ کیا کوئی انہیں درّے مارنے والا نہیں؟ جب میں نے بینڈ باجے والی ایک بارات گزرتی دیکھی تو انتظار کرتا رہا کہ دیکھیں کچھ نوجوان بینڈ باجے والوں کو ان خرافات سے منع کرنے کے

* شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد

لیے کب آنکھیں لال کرتے ہیں۔ جب مجھے ایک اسکول میں لنچ کی دعوت ملی اور میزبان نے کھانے کی میز پر تعارف کرواتے ہوے کہا، یہ ہیں مولانا فلاں فلاں اور یہ ہیں قاری صاحب۔ یہ ہیں جگدیش بھائی اور ان کے برابر ہیں مفتی فلاں فلاں اور وہ جو سامنے بیٹھے مسکرا رہے ہیں، وہ ہیں ہم سب کے پیارے لال موہن جی..... تو میں نے اپنے ہی بازو پر چٹکی لی کہ کیا میں دیوبند میں ہی ہوں!

اب میں واپس دلّی پہنچ چکا ہوں اور میرے سامنے ہندوستان اور پاکستان کا ایک بہت بڑا تفصیلی نقشہ پھیلا ہوا ہے۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے اس نقشے میں وہ والا دیوبند تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جو طالبان، سپاہِ صحابہ اور لشکرِ جھنگوی جیسی تنظیموں کا دیوبند ہے!!!!''

بی بی سی کے اس شذرے میں دیوبند کی جو روادارانہ تصویر کھینچی گئی ہے اور جس طرح سے معاشرے میں پائی جانے والی 'خلافِ شرع' چیزوں کے بارے میں وہاں کی یہ پالیسی واضح ہو رہی ہے کہ زبانی امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور عملی طور پر عدمِ مداخلت کی راہ اختیار کی جائے، وہ صرف آج کے دیوبند کی نہیں ہے بلکہ شروع دن سے ہے۔ آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے وہاں کوئی جاتا تو وہ بھی یہی کچھ محسوس کرتا۔ ظاہر ہے کہ اتنے طویل عرصے تک قائم رہنے والی عملی صورتِ حال کو نہ تو محض اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی وجہ محض مداہنت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہت سے حلقوں کے لیے آج کل 'دیوبندی اسلام' ایک معمّا بنا ہوا ہے۔ ان لوگوں کی خدمت میں یہ بنیادی گزارش ہے کہ دیوبندی فکر سے سیاسی پہلو کو الگ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ دو حوالے ایسے ہیں جو اس فکر کو سیاسی سوچ سے جوڑتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دارالعلوم دیوبند کے بانیان اور ابتدائی سرپرستان میں ایسے لوگ شامل تھے جو ۱۸۵۷ء کے معرکے میں شامل رہے تھے یا کم از اس تحریک کے مقاصد سے گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ دوسرا حوالہ یہ کہ ان حضرات کا سلسلۂ تأثر اور شاگردی شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے جا کر ملتا ہے اور یہ دونوں شخصیات محض عقائد وعبادات وغیرہ کی تفہیم کی حد تک ہی عالمِ دین نہیں تھے، بلکہ اپنے وقت کے پائے کے سیاسی واجتماعی مفکر بھی تھے، اس لیے جو شخص دیوبندی فکر سے اس کا صحیح پس منظر سمجھ کر وابستہ ہے، وہ خود کو اپنے زمانے کے حالات اور ان کے مسلمانوں اور اپنے ملک پر مرتب ہونے والے اثرات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

البتہ بی بی سی کے شذرہ نگار اگر حجّاموں اور سی ڈیز کی دکانیں جلانے، دوسرے مذاہب یا مخالف فرقوں کی عبادت گاہوں پر حملے کرنے والا دیوبند تلاش کرنے نکلے تھے اور وہ انہیں نہیں ملا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ اس طرح کا دیوبند کبھی موجود تھا ہی نہیں۔ اس طرح کا دیوبند پچھلی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کے اوراق میں بھی کہیں نہیں ملے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دیوبند بنانے یا ابتدا میں اس کی سرپرستی کرنے والوں میں کئی لوگ ۱۸۵۷ء کے معرکوں کا حصہ رہے تھے اور یقیناً یہ ایک عسکری جدوجہد تھی جس کو برائے نام اور بہت کمزور سہی، ایک مسلمان بادشاہ کی چھتری حاصل تھی، لیکن اس تحریک کے متوقع نتائج سامنے نہ آ سکے اور آخری مسلمان بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون لے جایا گیا جہاں انہوں نے عبرت ناک انداز سے اپنی اسیری کے ایام گزارے اور ہندوستان جس پر اب تک کمزور سی برائے نام مسلمان بادشاہت قائم تھی، براہِ راست انگریزوں کے زیرِ اقتدار چلا گیا۔ اس کے بعد ان حضرات کی طرف

سے عسکری رنگ رکھنے والی تحریک وہ تھی جو تحریکِ ریشمی رومال کے نام سے معروف ہوئی۔ اس کے روحِ رواں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ماسٹر مائنڈ مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس اسکیم کا بھی ایک حصہ اس کے بارے میں اس وقت کی خلافت کو اعتماد میں لیا جانا اور اس کا تعاون حاصل کرنا تھا۔ گویا یہ تحریک بھی خالصتاً پرائیویٹ عسکری تحریک نہیں تھی۔ یہ تحریک بھی درمیان میں رہ گئی اور شیخ الہندؒ گرفتار ہو کر مالٹا چلے گئے، لیکن ہندوستان کی آزادی جیسے مقاصد سے یہ لوگ اب بھی دستبردار نہیں ہوئے، البتہ طریقِ کار اور پالیسی میں بہت بڑی تبدیلی یہ آئی کہ مقاصد کے حصول کے لیے عسکری راستہ اختیار کرنے کی بجائے پرامن سیاسی جدوجہد کی پالیسی کو اپنایا گیا، جیسا کہ خود حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ کی تصریح آئندہ سطور میں آ رہی ہے۔ دیوبندی حلقوں میں سیاسی معاملات پر اختلافِ فکر ونظر تو پہلے ہی موجود تھا، لیکن شیخ الہند کے انتقال کے بعد کے حالات میں یہ اختلاف زیادہ نمایاں ہو گیا اور بنیادی طور پر دیوبندی مکتبِ فکر میں دو بڑے سیاسی رجحانات زیادہ متعارف ہوئے۔ ایک کی نمایاں شخصیات میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تھے، جبکہ علماءِ سہارنپور خصوصاً حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کا سیاسی رجحان بھی کافی حد تک اس سے مشابہت رکھتا تھا۔ دوسرے رجحان کی نمائندگی کرنے والے علماء میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور جمعیت علماءِ ہند سے وابستہ دیگر علماء تھے، لیکن ان دونوں طبقوں میں قدرِ مشترک یہ تھا کہ دونوں نے ہی پرامن سیاسی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔

آج کل ملک میں جو پرتشدد کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان سب کی نسبت عموماً دیوبندی مکتبِ فکر کی طرف کی جا رہی ہے۔ ان میں سے بعض تنظیموں کے لوگوں کی دیوبندی مکتبِ فکر کی نسبت واضح ہے، بعض کی ان کی طرف نسبت غلط بھی ہو سکتی ہے، بہت سی کارروائیوں کے بارے میں کچھ کہنا ہی انتہائی مشکل ہوتا ہے، اور غلط نسبت کی وجوہات میں حالات کے گڈمڈ ہونے اور بعض لوگوں کی بدنیتی کے علاوہ شاید دیوبندی قیادت کی غیر محتاط یا غیر واضح روش بھی شامل ہو، البتہ اس بات کا انکار انتہائی مشکل ہوگا کہ دیوبندیت کی طرف نسبت رکھنے والوں میں ایسے کچھ نہ کچھ عناصر ضرور موجود ہیں جو نیک نیتی سے متشددانہ یا غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کی تائید کرتے یا کم از کم اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آج مجھے پرتشدد جدوجہد پر یقین رکھنے والے انھی نوجوانوں سے بات کرنی ہے جو واقعی خود کو علماء دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان حضرات کے لیے ایک تو خود وہ تصویر قابلِ غور ہے جو بی بی سی کے شذرے میں پیش کی گئی ہے۔ یہ صورتِ حال کوئی بھی شخص کسی بھی وقت دیوبند جا کر دیکھ سکتا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، دیوبند کا یہ طرزِ عمل شروع ہی سے یہ رہا ہے اور یہ بزرگانِ دیوبند کی سوچی سمجھی پالیسی یا ان کے فہمِ دین کا حصہ ہے۔ ہمارے دور کے یہ نوجوان جس طرح کا دیوبند اپنے ذہنوں میں لے کر اس سے راہنمائی اور انسپائریشن لے رہے ہیں، انہیں واقعی یہ سوچنا چاہیے کہ اس طرح کا دیوبند عملاً کہیں موجود بھی رہا ہے؟ ان لوگوں کے لیے علماءِ دیوبند کی نمایاں شخصیات میں سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد الیاس وغیرہ سے زیادہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی آئیڈیل سمجھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ حضرت مولانا مدنیؒ اور جمعیت

علماء ہند سے وابستہ بزرگوں کے فکر وعمل کے پیروکار ہیں، حالانکہ خود مولانا مدنیؒ وغیرہ کی فکر میں اس طرح کی سوچ کہیں نہیں ملتی۔ ایک تو کسی مخصوص فرقے کو ختم کرنے کا وہ طریقہ انہوں نے کبھی اختیار نہیں کیا جو آج ان کی طرف نسبت رکھنے والے بعض لوگوں نے اپنایا ہوا ہے۔ دوسرے اس انداز کا نفاذِ شریعت جیسا آج بعض لوگوں کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے، مولانا مدنیؒ کے ہاں دور دور تک اس کا تصور نہیں ملتا۔ دیوبند ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس میں حضرت مولانا مدنیؒ کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ دار العلوم دیوبند کے طلبہ جو ان کے جاں نثار بھی تھے اور ان کی تعداد بھی بہت بڑی تھی، ان کو ساتھ لے جاتے اور دیوبند کے پولیس اسٹیشن، کچہری یا کسی اور سرکاری عمارت پر قبضہ کر کے اپنے مطالبات انگریز حکومت کے سامنے پیش کر دیتے یا مسلّح ہو کر دیوبند میں اسی طرح کی شریعت نافذ کرنے کا اعلان کر دیتے جو آج بعض جگہوں پر کبھی کبھار نظر آ جاتی ہے، لیکن حضرت مدنیؒ سمیت دیوبند کے کسی بزرگ کو اس طرح کی نہیں سوجھی۔ جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، مجھے حضرت مدنیؒ اور ان کے ہم فکر حضرات کی سیاسی فکر میں اس طرح کے نفاذِ شریعت کا کوئی خانہ نظر نہیں آیا۔ حضرت مدنیؒ اور ان کے ہم نوا علماء کی سیاسی فکر کے بنیادی عناصر درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ حضرات ہندوستان کو اپنا وطن اور گھر سمجھتے تھے، صرف اپنے مخصوص علاقے یا صوبے کو نہیں، پورے ہندوستان کو جو اُس وقت ایک ملک کی شکل میں موجود تھا۔ وہ اپنے اس وطن سے محبت کرتے اور اس کی سالمیت پر یقین رکھتے تھے، اسی لیے ان حضرات کا شمار نیشنلسٹ اور وطن پرور علماء میں ہوتا تھا۔ یہ عنصر حضرت مدنیؒ کے مکتوبات وغیرہ کے علاوہ جمعیت علماءِ ہند کے نمایاں صاحب قلم عالم مولانا محمد میاںؒ کی تصانیف میں بہت کثرت سے مل جائے گا۔ مولانا محمد میاںؒ کے مطابق شاہ ولی اللہؒ کی کوششوں کا منشا اور باعث بھی یہ تھا کہ ”**آپ کے قلب حساس میں بربادیٔ وطن کا درد تھا**“۔ مولانا محمد میاں ہی شاہ ولی اللہؒ کے دور کا نقشہ کھینچتے اور نوحہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں ”ایک گروپ نے نادر شاہ کو بلایا تو دوسرے گروپ نے ابدالی کو دعوت دی۔ نوعیت میں کسی قدر فرق رہا، **مگر وطن اور اہلِ وطن کو نقصان پہنچانے میں دونوں ایک دوسرے سے بڑھے رہے**“۔

یہ حضرات اپنے اس وطن کو متحد رکھنا چاہتے تھے، انہیں یہ بات بھی گوارا نہیں تھی کہ لسانی، صوبائی یا نسلی بنیاد پر تو درکنار، مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کے لیے بھی اس ملک اور وطن کے ٹکڑے ہوں، حالانکہ انہیں یقین تھا کہ متحدہ ہندوستان میں جو حکومت قائم ہوگی، اس میں غلبہ ہندوؤں کا ہوگا۔ وہ حضرات ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے ہندوستان ان کا وطن تھا۔ ہماری نسل کے لوگ پاکستان ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے، ظاہر ہے کہ ہمارا وطن یہی ہوگا، کیا اپنے اس وطن سے اسی انداز سے محبت کرنا، اس کی سالمیت کے لیے فکر مند ہونا اور ہر ایسی تحریک کے بارے میں محتاط رہنا جس سے اس کی سالمیت پر حرف آتا ہو، خواہ اس میں نام اسلام ہی کا استعمال ہو رہا ہو، جمعیت علماء ہند کے ان علماء کی اتباع کا تقاضا نہیں ہے؟

۲۔ یہ حضرات اپنے وطن ہندوستان کی انگریزوں سے مکمل اور جلد آزادی چاہتے تھے۔

۳۔ ہندوستان کی انگریز سے آزادی میں ان کے پیشِ نظر ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اس سے عالم اسلام کی آزادی

اور سر بلندی کا راستہ کھلے گا۔ گویا شریعت کے جزوی احکام کی بزورِ طاقت نفاذ سے زیادہ ان کی نظر اس بات پر تھی کہ کن پالیسیوں سے بحیثیتِ مجموعی عالمِ اسلام کی قوت اور سر بلندی کے بارے میں کیا نتائج مرتب ہوں گے۔

۴۔ وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے عدمِ تشدد پر مبنی طریقۂ کار اختیار کرنے کو اپنی طے شدہ پالیسی قرار دیتے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ۱۸۵۷ء کے معرکے اور تحریک ریشمی رومال سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہونے کے بعد انہوں نے عسکری کی بجائے سیاسی جدوجہد کے راستے کو اپنایا۔ ان دو عسکری تحریکوں پر بھی کسی نہ کسی درجے میں مسلمان بادشاہ یا خلافت کی چھتری موجود تھی۔ یہ بھی واضح تھا کہ پرامن سیاسی جدوجہد سے یہ مقاصد جلدی حاصل ہونے والے نہیں ہیں، چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو بین الاقوامی حالات بنے، وہ اگر نہ بنتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ حصولِ آزادی میں اور کتنا طویل عرصہ لگ سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان حضرات کو حصول مقاصد کے لیے کسی شارٹ کٹ کی تلاش نہیں تھی، ان کی نظر جلد از جلد منزل کے حصول یا رفتار کی تیزی سے زیادہ راستے کے درست اور بے خطر ہونے پر تھی۔ سیاسی اور پرامن سیاسی جدوجہد کی راہ اپنانا دیوبندی سیاسی فکر کی دونوں بڑی شاخوں میں قدرِ مشترک ہے۔ تحریکِ پاکستان کے حامی علماء نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور پاکستان بن جانے کے بعد نفاذِ اسلام کے لیے بھی پرامن راستے ہی کو ترجیح دی، اس میں یہ بات ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنی کہ یہ راستہ طویل اور دور ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا مدنیؒ اپنے ایک طویل سیاسی مکتوب میں جس میں وہ اس اعتراض کا بھی جواب دے رہے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل گئے ہیں، فرماتے ہیں:

> ''اگر [ہندوؤں کے ساتھ ملنے سے] یہ مراد ہے کہ میں کانگریس کا ممبر ہو گیا ہوں تو میں کانگریس کا اس وقت سے ممبر ہوں جب سے کہ مالٹا سے ہندوستان آیا۔ اس سے پہلے میں انقلابی تشدد آمیز خیالات کے ساتھ انگریزی موجودہ اقتدار کا مخالف تھا اور اسی بنا پر مالٹا کی چار برس کی قید ہوئی تھی، اور **واپسی مالٹا کے بعد عدمِ تشدد کے ساتھ انگریزی اقتدار کا مخالف اور ہندوستان کی آزادی کا حامی ہو گیا ہوں۔** ۱۹۲۰ء سے برابر سالانہ فیس ممبری اس میں اور جمعیت علماء میں ادا کرتا ہوں۔ خلافت کا بھی اسی وقت سے ممبر ہوں، مگر خلافت فنا ہو گئی، اس لیے اب اس میں کوئی حصہ نہیں رکھتا، اور میں ہر اس انقلابی جماعت میں شریک ہونے کو تیار ہوں جو انگریزی اقتدار کو ہندوستان سے ختم کرنے یا کم کرنے کی سچائی سے کوشاں ہو، **اور اپنی پالیسی عدمِ تشدد کی رکھتی ہو۔**'' (مکتوبات شیخ الاسلام ۲/۱۲۶، مکتوب نمبر ۳۶)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا مدنیؒ کے نزدیک کسی بھی جماعت کے ساتھ تعاون کی بنیادی دو شرطوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ جماعت عدمِ تشدد کی پالیسی رکھتی ہو۔ اپنے ایک عربی مکتوب میں فرماتے ہیں جس کا ترجمہ مرتبِ مکتوبات مولانا نجم الدین اصلاحی ہی کے الفاظ میں پیش ہے:

> ''انگریز دجالوں کی طرف سے میرے پاس نوٹس آیا ہے کہ تمہاری گرفتاری کا سبب یہ ہے کہ تم موجودہ آئین پسند حکومت کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہو اور [برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی] جنگی کارروائیوں میں رکاوٹ پیدا کرتے ہو۔ میں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اقوامِ عالم کے نزدیک آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور حکومت بھی اس فریضے کو تسلیم کرتی ہے، چنانچہ اسی پیدائشی حق کے لیے میری تگ ودو اور تحریک ہے، **لیکن میں اس مقصد کے حاصل کرنے کے**

لیے ہنگامہ اور زیادتی کو پسند نہیں کرتا، اور نہ میں نے جنگی کارروائیوں میں رکاوٹ و مداخلت کی ہے۔ جس نے خبر دی وہ جھوٹا ہے، لہٰذا مجھ کو فوراً رہا کرنا چاہیے، مگر اب تک جواب نہیں آیا۔ اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ والسلام''

اپنے ایک طویل مکتوب (مکتوبات جلد اول، مکتوب نمبر ۶۳) میں مغلیہ بادشاہ اکبر کی 'رواداری مذہبی' پالیسیوں سے کافی حد تک اتفاق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اگر اس [اکبر] کے جیسے چند بادشاہ اور بھی ہو جاتے یا کم از کم اس کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال [کہ نفرت کی فضا پیدا کر کے لوگوں کو اسلام سے روکا جائے] مدفون ہو جاتی اور اسلام کے دلدادہ آج ہندوستان میں اکثریت میں ہوتے۔ اکبر نے نہ صرف اشخاص پر قبضہ کیا تھا، بلکہ عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا، مگر ادھر تو اکبر نے نفسِ دینِ اسلام میں کچھ [؟] غلطیاں کیں جن سے مسلم طبقہ میں اس سے بدظنی ہوئی، اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے، ادھر برہمنوں کے غیظ وغضب میں اپنی ناکامیاں دیکھ کر اشتعال پیدا ہوا۔''

مولانا مدنیؒ کی اس رائے سے، ظاہر ہے کہ دیگر اہل علم و دانش کو اختلاف ہو سکتا ہے بلکہ اختلاف ہے۔ یہاں صرف مولانا مدنیؒ کی سیاسی فکر کے خدوخال بیان کرنا مقصود ہیں۔ مذہب کے بارے میں اکبر کی پالیسیوں کو ہم سمجھنے میں آسانی کے لیے اُس وقت کے سیکولرازم سے تعبیر کر سکتے ہیں اور آج کا سیکولرازم یقیناً مسلمانوں کو اکبر کے سیکولرازم سے زیادہ ہی مذہبی آزادیاں دیتا ہوگا، کم نہیں۔ آج کا پاکستان نظریاتی اور دستوری طور پر سیکولر ریاست نہیں ہے۔ اس کا دستور نہ صرف اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کو بھی تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کا کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اصطلاحی لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسی ریاست ہے جو اللہ و رسول کی 'التزامِ اطاعت' کیے ہوئے ہے اور یہ بھی اہلِ علم جانتے ہیں کہ کسی فرد کے مسلمان ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم سمجھے، عملاً اطاعت نہ بھی کرے تب بھی وہ رہتا مسلمان ہی ہے۔ اس لیے ریاستِ پاکستان ایک ایسے مسلمان کی طرح ہے جس کے عمل میں کمی کوتاہی تو ہے، لیکن وہ اصولی طور پر اللہ و رسول کی اطاعت کو لازم سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔ پھر عملی طور پر اور شعائرِ اسلام کے احترام کے عمومی رویے کے اعتبار سے بھی یہ ملک آج کے بہت سے مسلمان ملکوں اور اکبر کے 'رواداری' دور کے مقابلے میں بسا غنیمت نظر آئے گا۔ اگر اسے ہم تھوڑی دیر کے لیے ایک سیکولر سٹیٹ بھی مان لیں تو بھی حضرت مولانا مدنیؒ بعض اعلیٰ وارفع مقاصد کے پیش نظر اس طرح کے سیکولرازم کے بارے میں نرم گوشہ اور رویہ رکھ رہے ہیں۔ ان اعلیٰ مقاصد میں اسلام کی تبلیغ واشاعت اور غیر مسلموں کے سامنے اس کی رواداری تصویر پیش کرنا جس سے وہ اسلام سے دور ہونے کی بجائے قریب ہوں، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جمعیت علماء ہند کے دیگر رہنماؤں کے ہاں ہو سکتا ہے اکبری دور کے ساتھ یہ نرم گوشہ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ مل جائے۔ اکبر کا یہ سیکولرازم یا مذہبی رواداری کا رویہ ایک غیر مسلم ریاست کے اندر نہیں تھا بلکہ دارالاسلام میں تھا، اس لیے کہ مغلیہ دور کے ہندوستان کو علماء دارالاسلام قرار دیتے ہیں۔ اگر پاکستان میں اس سے بہت کم درجے کی 'لادینیت' کے ساتھ نہ تو نرم گوشہ رکھنے کا کہا جائے، نہ اسے برقرار رکھنے کی بات کی

جائے، بلکہ اس صورتِ حال کے خاتمے کے لیے بھرپور جدوجہد کی ضرورت کو تسلیم کیا جائے اور صرف اتنا کہا جائے کہ یہ جدوجہد پرامن اور غیر متشددانہ ہو اور اس سے ریاستِ پاکستان کے ساتھ جنگ یا اس سے بغاوت کا تأثر نہ ابھرے تو اکبری دور کے بارے میں مولانا مدنیؒ کے لب ولہجہ کی روشنی میں یہ کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔

اکبری دور ہی کے بارے میں مولانا محمد میاںؒ نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ مجدد الفِ ثانیؒ نے اکبر کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کی؟ اس کی ایک وجہ تو مولانا محمد میاںؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ''نصِ حدیث کے بموجب مسلمان بادشاہ سے بغاوت صرف اسی وقت جائز ہے جبکہ واضح اور بیّن طور پر اس سے ارتکابِ کفر ہو'' جبکہ مولاناؒ کی نظر میں اکبر کے کفر میں تردد کی گنجائش موجود تھی، اس لیے بموجبِ نصِ حدیث اس کے خلاف بغاوت جائز نہیں تھی۔ دوسری وجہ مولانا محمد میاںؒ کی نظر میں مجدد صاحب کے بغاوت نہ کرنے کی یہ تھی کہ جہاد کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ معروف جہاد بالسیف کا ہے، دوسرا طریقہ جہاد کا وہ ہے جو مکّی دور میں اختیار کیا گیا۔ مجدد صاحب نے جہاد تو کیا لیکن دوسرے طریقے سے۔ اس دوسرے طریقے کی وضاحت میں مکی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے مولاناؒ لکھتے ہیں:

> ''اور پھر غور کرو کہ یہ انقلاب تلوار کی طاقت سے ہوا یا حق وصداقت، اخلاق وضمیر، ایثار اور قربانیوں کی خاموش قوت سے؟ بلاشبہ یہ قوی اور نہایت مضبوط **طریقۂ جنگ** ہے جو اس وقت تک کیا جاتا ہے جب تک اس کی کامیابی کے امکانات باقی رہیں اور اسی **طرزِ جنگ** [مکی دور کے طریقے] کو **مقاومت بالصبر** کے مذہبی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور آج کل کی اصطلاح میں **عدمِ تشدد کی جنگ** کہا جاتا ہے۔''

آگے چل کر مولاناؒ، سیوطی کی الاتقان کے حوالے سے بتلاتے ہیں کہ جنگ کے دونوں طریقے یعنی مکی اور مدنی طریقے یا تلوار اور عدمِ تشدد والے طریقے آج بھی مشروع ہیں۔ ان میں کوئی طریقہ منسوخ نہیں ہے، بلکہ عدمِ تشدد والے طریقے کے بارے میں مولانا کے الفاظ'' جو اس وقت تک جاری رکھا جاتا ہے جب تک اس کی کامیابی کے امکانات باقی رہیں'' سے تو بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا کے نزدیک اصل طریقہ یہی ہے۔ جب تک اس میں کامیابی کے امکانات ہوں، اسے استعمال کرنا چاہیے۔ اسی طریقے یعنی مقاومت بالصبر یا جہاد باللسان والے طریقے کی افضلیت پر حدیث ''افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر'' سے استدلال کرنے کے بعد مولانا فرماتے ہیں: ''بہر حال اس **طرزِ جہاد** کے لیے ضرورت تھی کہ حضرت مجدد صاحب اپنی صداقت نیز سلطان اور سلطنت کی خیر خواہی کا آخری ثبوت پیش کریں۔'' (علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد اول ص ۱۸۰) اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمعیت علماءِ ہند کے ایک بلند مرتبہ راہ نما کی نظر میں اگر مسلمان حکمران غلط راستے پر چل نکلے تو سلطان اور سلطنت یا زیادہ بہتر لفظوں میں ریاست کے ساتھ خیر خواہی کا آخری ثبوت پیش کرنا بھی ایک **طرزِ جہاد** کا حصہ ہو سکتا ہے۔

نیز مولانا محمد میاںؒ ہی کی نظر میں ـــ قطع نظر اس سے کہ شاہ صاحب کی طرف یہ نسبت کس حد تک صحیح ہے ـــ شاہ ولی اللہؒ کی فکر کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ''قرآن حکیم کی رو سے ہمہ گیر حق وصداقت، انسانی شرف وعظمت اور اعلیٰ اخلاق کے نام پر جو جدّ وجہد ہو، وہ اسی وقت جہاد قرار دی جا سکتی ہے جب کہ نہ قومی یا نسلی اقتدار کا تصور سامنے ہو اور نہ ہی فرقہ

پرستی اور دھڑے بندی کی کوئی شکل فتنہ وفساد کی تخم ریزی کر سکے۔'' (علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد دوم ص ۱۹) پھر مولانا نے جہاں عدم تشدد کی اس پالیسی کی شرعی بنیادیں جا بجا بیان فرمائی ہیں، وہیں عملی اور زمینی حقائق کی رو سے بھی اب تک کی عسکری کوششوں کی عدمِ کامیابی کی وجوہات کا جائزہ لے کر عدمِ تشدد کی اس نئی پالیسی کی پرزور وکالت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ پالیسی اختیار کرنے والے بزدل، بےعمل یا عافیت پسند لوگ نہیں تھے، بلکہ یہ وہی قافلہ ہے جو پہلے عسکری کوششوں میں دادِ شجاعت دے چکا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ''حضرت سید صاحب شہیدؒ کی تحریک کے آغاز سے ۱۹۱۵ء تک یعنی صرف پچاسی سال کے عرصے میں ہندوستان کی صرف یہی ایک جماعت ہے جس نے چار مرتبہ [عسکری] انقلاب کی جدوجہد کی۔ بےعمل اعتراض کرنے والوں کے پاس اب بھی پرتشدد انقلاب کے لیے کوئی پروگرام نہیں۔'' (علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد پنجم ۳۲۲) مولانا نے عسکری کوششوں کو ترک کرنے کی جو وجوہات بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہی ہے کہ بدلے ہوئے اس وقت میں ان کے بارآور ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔ ان عسکری کوششوں میں بہادری، دشمن کو پریشان کرنے اور جزوی کامیابیوں کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ان کی بنیاد پر خوش فہمیوں اور بہادریوں کے چند قصوں میں ذہن کی سوئی اٹکائے رکھنے کی بجائے پالیسی سازی کے لیے زمینی حقائق اور اب تک کے تجربات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ کیا اس طرح کی جدوجہد میں جزوی اور عارضی کامیابیوں اور کچھ عرصے کے لیے کسی ریاست کو پریشان رکھنے کے علاوہ فیصلہ کن کامیابی کے بھی امکانات ہیں یا نہیں؟ اسّی سال کے عرصے پر محیط پالیسی کو تقدّس کا درجہ دے کر اس پر جمود اور تاویلات وتوجیہات کے ذریعے اس کی وکالت کرتے رہنے کی بجائے زمینی حقائق کی روشنی میں اب تک کے سفر کا ازسرِ نو جائزہ لے کر نیا راستہ تلاش کرنا ان حضرات کی جدّ وجہد کا ایک اہم باب ہے جس کا اثر ان کے نام لیواؤں اور متبعین میں بھی نظر آنا چاہیے۔ مثلاً ایک جگہ مولانا محمد میاں فرماتے ہیں: ''جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مارشل لا نے ہندوستانیوں کو کافی سبق دے دیا کہ شورشِ بغاوت کو ایک جابر اور قاہر حکومت کس طرح کچل سکتی ہے۔'' (غالباً حضرت تھانویؒ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ ریاست کا عسکری مقابلہ عموماً ریاست ہی کر سکتی ہے، غیر ریاستی عناصر نہیں) مزید فرماتے ہیں کہ ''کوئی بیرونی طاقت پشت پر نہ ہو تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اسلحہ اور قوت کے ساتھ انقلابی جدوجہد کے لیے خرچ کا کیا انتظام ہو؟''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا محمد میاں اب تک کے تجربات سے یہ سمجھے ہیں کہ ایک ریاست کے اندر رہ کر اس کے خلاف لڑنے کی ایک بہت بڑی شرط یہ ہے کہ باہر کی کوئی مضبوط طاقت اس کی پشت پناہی کر رہی ہو۔ اس سے پہلے مولانا یہ فرما چکے ہیں کہ جرمنی کی شکست کے بعد برطانیہ کے خلاف عسکری جدوجہد کی کامیابی کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔ اس قسم کے خرچے کا اگر انتظام ہو بھی جائے جس کی نفی مولانا مذکورہ بالا اقتباس میں فرما رہے ہیں، تب بھی یہ سوال برقرار رہے گا کہ کسی طاقت کے خرچے پر چلنے والی عسکری تحریک اپنے مقاصد حاصل کرے گی یا خرچہ دینے والی طاقت کے؟ ایک جگہ انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا ہے: ''اٹھارہویں صدی کے آغاز تک سرفروشوں کی کثرت سامانِ فتح ہوا کرتی تھی، لیکن اب توپوں، رائفلوں وغیرہ جدید آلاتِ حرب [دوسرے لفظوں میں ٹیکنالوجی] اور

فراہمی سرمایہ [دوسرے لفظوں میں اقتصادی قوت] پر فتح وشکست کو منحصر کر دیا تھا۔'' (شاندار ماضی ۱۶۰/۵) ایک جگہ علماء سے پُرتشدد جدوجہد کا مطالبہ کرنے والوں سے پوچھتے ہیں کہ شیخ الہندؒ نے کیا اپنی عمر کے پچاس سال صرف نہیں کیے تھے؟ لیکن اب وہی شیخ الہند مولانا محمد میاں کے الفاظ میں ''۴۲ سال بعد مسلمانوں کو ایک مشترکہ اور آئینی جدوجہد کی ہدایت فرمارہے ہیں۔'' (شاندار ماضی ۳۶۵/۵)۔

بات ذرا دور نکل گئی، اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ اکبر کے مذہبی طرزِ عمل کو، جو دینی اعتبار سے آج کے سیکولرزم سے بھی گیا گزرا تھا، بعض اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے حضرت مولانا مدنیؒ قابلِ گوارا سمجھ رہے ہیں۔ مذکورہ اقتباس کے بعد مولانا مدنیؒ نے اپنے مدّعا کے ثبوت کے لیے صلح حدیبیہ اور اس کے اثرات کا ذکر کیا۔ اس کے بعد ان اعلیٰ مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے جن کی خاطر یہ ڈھیلی ڈھالی پالیسی اختیار کی جاسکتی ہے، وہ فرماتے ہیں (اصل مقصود حضرت کا یہی اقتباس پیش کرنا تھا، تمہید ذرا لمبی ہوگئی، اقتباس اگرچہ طویل ہے لیکن پڑھنے کے قابل ہے):

''آپس میں اختلاط ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے جنھوں نے افلاذ اکباد قریش کو کھینچ [کر] صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بناتے ہوئے مکہ سے مدینے کو پہنچادیا۔ حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اس طرح حلقہ بگوش اسلام بن گئے کہ قریش کی ہستی فنا ہوگئی۔

''الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا اور تنافر باعث ضد اور ہٹ اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے اور وہ اسلامی ترقی میں سدراہ ہونے والا۔ اور چونکہ اسلام تبلیغی مذہب ہے، اس لیے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہوسکے، غیر کو اپنے میں ہضم کرے نہ یہ کہ ان کو دور کرے۔ اس لیے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں تو ہم کو ان کے ساتھ نفرت نہ کرنا چاہیے، اگر وہ ہم کو نجس اور ملچھ کہیں تو ہم کو ان کو یہ نہ کہنا چاہیے، اگر وہ ہم سے چھوت چھات کریں تو ہم کو ان سے ایسا نہ کرنا چاہیے، وہ ہم سے ظالمانہ برتاؤ کریں تو ہم کو ان سے ظالمانہ غیر منصفانہ برتاؤ نہ کرنا چاہیے۔ اسلام پدر شفیق ہے، اسلام مادر مہربان ہے، اسلام ناصح خیرخواہ ہے، اسلام جالب اقوام ہے، اسلام ہمدرد بنی نوع انسان ہے۔ اس کو غیروں سے جزاء سیئة سیئة مثلها پر کاربند ہونا شایاں نہیں، بلکہ اس کی غرض [تبلیغ] کے لیے سدیاجوج ہے۔ کفر نے کبھی اسلام سے عدل وانصاف نہیں کیا۔ [کیف وان یظهروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا و لا ذمة الخ وغیرہ شاہد عدل ہیں۔ مگر اسلام نے انصاف، عدل واحسان کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور نہ چھوڑنا مناسب تھا، اگرچہ جذبات انتقامیہ بہت کچھ چاہتے تھے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کچھ لوگوں کی یہ سازش ہو کہ وہ منافرت اور تلخی کا ماحول پیدا کر کے لوگوں کے قبول اسلام میں رکاوٹ بنیں، جیسا کہ آج آگ کل ایسی طاقتوں کی کوشش ہے جن کے ہاتھ میں میڈیا کی طاقت ہے کہ وہ اسلام کی خاص قسم کی تصویر پیش کر کے لوگوں کو اسلام سے دور رکھیں، تو اکبری پالیسی جیسی چیزوں اور بعض غیر مسلموں کی طرف سے انتہائی توہین آمیز رویے کو بھی گوارا کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ مولانا مدنیؒ کے مذکورہ مکتوب میں ہندوؤں کے اسی طرح کے رویے کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ سائل کے ساتھ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک ریلوے اسٹیشن پر اس کا ہاتھ غلطی سے کھانا بیچنے والے ایک ہندو کی پتیلی کے صرف ڈھکن کو لگ گیا تھا۔ اس پر اس نے نہ صرف اس

سارے کھانے کو پلید قرار دے کر ضائع کرنے کا ذلت آمیز فیصلہ سنا دیا بلکہ ہاتھ لگانے والے مسلمان سے بطور تاوان اس کھانے کی قیمت کا بھی مطالبہ کیا جو اس مسلمان نے ادا کر دی۔ اس پر سائل نے مولانا مدنیؒ سے یہ سوال کیا ہے کہ اگرچہ ہمارے مذہب میں کافر کا جھوٹا پاک ہے، لیکن ہندوؤں کے اس طرزِ عمل کے ردّ عمل میں کیا ہم بھی ان کے ساتھ یہی طرز اختیار نہ کریں۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مدنیؒ کے نزدیک اسلام کی تبلیغ، لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے قریب کرنا اور منافرت کی فضا کم کرنا پالیسی کا اہم ترین حصہ ہے۔

مولانا محمد میاںؒ نے ایک جگہ یہ بھی بتایا ہے کہ شیخ الہندؒ جو انقلاب لانا چاہتے تھے، اس کے ذریعے وہ ایک جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح جمعیت علماء ہند کے ۱۹۳۹ء کے ایک اجلاس کے بعد جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا ہے کہ ''جمعیت علماء جمہوری اصول کو پسند کرتی ہے اور اس کے نزدیک اسلامی جمہوریت کا جو خاکہ ہے، وہ یورپین جمہوریت کے اصول سے بہت ارفع واعلیٰ ہے۔ اسلامی جمہوریت میں اکثریت اور اقلیت پورے اطمینان اور تحفظِ حقوق کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔'' (شاندار ماضی ۴۷/۶) اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان علماء کرام نے ایک ایسے جمہوری سیاسی نظام میں بھرپور حصہ لیا جو نہ صرف خالصتاً انگریزوں کا بنایا ہوا تھا، بلکہ اسے اس وقت چلا بھی براہِ راست انگریز ہی رہے تھے، چنانچہ انگریزی دور میں ہونے والے تقریباً تمام انتخابات میں جمعیت علماء ہند نے کسی نہ طرح اپنا کردار ادا کیا۔

حضرت مدنیؒ کے اندازِ فکر میں ایک بات یہ بھی ملتی ہے کہ اگر کسی معاملے کے بگڑنے میں حضرت کے خیال میں غیروں کی بجائے اپنوں کی غلطی کا دخل تھا تو اس کا انہوں نے کھل کر اظہار فرمایا جو یقیناً بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں ہندوؤں کی طرف سے ہونے والے مظالم کی ایک شکایت کے جواب میں فرماتے ہیں:

''جو مظالم بہار اور گڈھ مکتیشر وغیرہ میں دل گداز واقع ہوئے ہیں، یقیناً نہایت رنجیدہ اور سنگین ہیں، مگر میرے محترم! تصویر کے دوسرے رخ سے غافل رہنا بھی تو درست نہیں۔ ابتداء کس نے کی؟ کبھی اس پر غور فرمایا کہ نہیں؟ نواکھالی، پٹرہ میں ایسے ہی مظالم پہلے کس نے کیے تھے؟'' (مکتوبات جلد دوم، مکتوب نمبر ۸۵)

اسی خط میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الفتنة نائمة، لعن الله من ایقظها (اوکما قال) کا کیا مصداق ہے، جب کہ ان خباثتوں کی ابتدا مسلمانوں ہی سے ہو رہی ہے تو کس پر قصور کہا جا سکتا ہے۔''

بریلی سے ایک صاحب نے اس بات کی شکایت کی کہ آزادی کے بعد مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، مسلمانوں کو دھمکیاں مل رہی ہیں، ان کو اپنی املاک سے محروم کیا جا رہا ہے، غیر مسلموں کے جلسوں میں کھلے عام اسلام کو برا بھلا کہا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ حکومت کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے۔ (حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں پر اس طرح کے مظالم سے آزاد ہندوستان کی تاریخ بھری پڑی ہے۔) سائل نے اس بات پر بھی دکھ کا اظہار کیا کہ تحریکِ آزادی میں ہم نے ان ہندوؤں کی خاطر اپنوں سے مقابلہ کیا۔ جن کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا، انہی کی

طرف سے ہمارے ساتھ یہ برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ سائل نے حضرتؒ سے راہ نمائی طلب کی کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جواب میں تفصیلی مکتوب میں حضرتؒ نے ایک تو یہ فرمایا کہ ہندوستان آزاد کرا کے ہم نے ہندو پر کوئی احسان نہیں کیا، اپنا کام کیا ہے، لہٰذا دوسروں سے کسی صلے کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ دوسری بات اس خط میں بھی حضرتؒ نے یہی فرمائی کہ اس ساری خرابی کے اصل ذمہ دار مسلمان ہی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''آج آپ مجھ سے راہ نمائی دریافت فرما رہے ہیں۔ خود کردہ را علاج نیست، اگر میں کہوں تو کیوں غلط ہوگا! ہمارے بھائیوں نے کیا کیا نہیں کیا اور کیا کیا نہیں کر رہے ہیں؟

چوں از قومے یکے بے دانشی کرد　　نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

اگر ایک کی بے عقلی کا یہ حال ہو تو قوم کی اکثریت کی بے دانشی کا کیا نتیجہ ہوگا؟ بہرحال جو حالت آپ نے موجباتِ اضطراب کی ذکر فرمائی ہیں، وہ موجودہ کرتوتوں ہی کے نتائج ہیں، فالی اللہ المشتکی''

گویا حضرتؒ کے نزدیک یہ ساری خرابی مسلمان قوم کی اکثریت کی بے عقلی کا نتیجہ تھی۔ مسلمانوں نے ووٹ کے زور پر، پرامن جدوجہد کے ذریعے اگر ملک حاصل کر لیا تھا اور اس جرم کی سزا میں ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا تھا تو اس کی ذمہ دار بھی بے عقل مسلمان اکثریت تھی۔ قطع نظر اس سے کہ امرِ واقعہ کیا تھا اور قطع نظر اس سے کہ کیا مذہبی منافرت کے معاملے میں ہندو اتنا ہی معصوم تھا، جس نکتے کی طرف یہاں توجہ دلانا مقصود ہے، وہ حضرتؒ کی اخلاقی جرأت ہے جو اس قسم کے مکتوبات سے واضح ہو رہی ہے۔ حضرتؒ نے دیانت داری سے جو درست سمجھا، وہی کہا، بغیر لگی لپٹی رکھے کہا، تقریباً اسی لہجے میں کہا جس میں وہ پرایوں کی غلطیاں بیان فرماتے تھے۔ یہ نہیں سوچا کہ میرا مخاطب مجھ سے کیا سننا چاہتا ہے، بلکہ یہ دیکھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اپنوں کے بارے میں اس طرح کی جرأتِ اظہار غیروں سے بھی زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ حضرتؒ کو یقیناً اندازہ ہوگا کہ اس کی کیا قیمت چکانا پڑتی ہے اور واقعی حضرتؒ نے یہ قیمت چکائی بھی، لیکن کہا وہی جس کو دیانت دارانہ طور پر درست سمجھتے تھے۔ یہی فریضہ مختلف مواقع پر ذرا مختلف انداز سے سہی، مولانا تھانوی اور علامہ عثمانی نے بھی انجام دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے موجودہ ماحول میں قیادت اور جرأتِ اظہار کے اس معیار کی موجودہ دینی قیادت سے کس حد تک توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو صرف ان کی پسند کی غزل سنانے کی بجائے ان لوگوں میں اگر غلطی محسوس کریں تو صراحت کے ساتھ اس کی نشاندہی کریں، انہیں سمجھانے کی کوشش کریں، اس لیے کہ قیادت کا کام راہ نمائی کرنا بھی ہوتا ہے، صرف اپنی مقبولیت کا تحفظ کرنا نہیں۔

تیسری بات جس پر حضرت مدنیؒ نے اس مکتوب میں زور دیا ہے، وہ یہ ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ غیروں کے ان مظالم اور بدتمیزیوں کے باوجود صبر اور رجوع الی اللہ پر ہی اکتفا کریں، امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ کریں۔ اس موضوع پر تفصیل سے مدلل بات کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ احکامِ خداوندی پر مضبوطی سے گامزن رہیں اور اپنے مصائب اور تکلیف کے متعلق استقلال سے اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھیں، ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ، اور صبرِ جمیل پر مضبوط رہیں اور جزع فزع نہ کریں۔ جو مصائب پیش آئیں، ان کو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کریں، اور انما اشکو بثی

وحزنی الی اللہ پر عمل کریں، **امن وامان میں کوئی خلل پیدا نہ کریں** وفقنا اللہ وایاکم لما یحبہ ویرضاہ، آمین۔‘‘

امن وامان میں خلل پیدا نہ کرنے والی بات مولانا مدنیؒ ایک خالص اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ نہیں فرما رہے بلکہ ایک غیر مسلم حکومت کے بارے میں فرما رہے ہیں جس کے بارے میں لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ نام تو سیکولرازم کا لیتی ہے اور تمام مذاہب کے ماننے والے شہریوں کو برابر قرار دیتی ہے، لیکن عملاً مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ میں ناکام ہے بلکہ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم میں حکومتی شہ کا تأثر بھی موجود ہے۔ اوپر کی سطور میں دوبارہ ملاحظہ فرمالیں کہ حضرتؒ مسلمانوں پر مظالم اور اسلام کو برا بھلا کہنے کے کس طرح کے ماحول میں یہ لائحۂ عمل تجویز فرما رہے ہیں۔ صرف اپنوں کی غلطیوں کا احساس رکھنے، صبر کرنے اور نقضِ امن سے بچنے کے علاوہ کسی اور چیز کی تعلیم نہیں ہے۔ پتا چلا کہ حضرت مدنیؒ کے ہاں یہ بھی ایک راستہ اور لائحۂ عمل ہوسکتا ہے جس پر وہ اپنے اس مکتوب میں شرعی اور واقعاتی دلائل پیش کر رہے ہیں۔ آج اگر کوئی صاحب اسی طرح کے صبرِ جمیل اور امن وامان خراب نہ کرنے کا مشورہ دے دے اور اس کے ساتھ ظلم کے خلاف بھرپور آواز اٹھانے اور پرامن جدوجہد کرنے کا بھی کہے (جس کا حضرتؒ کے اس مکتوب میں ذکر نہیں ہے) تو مجھے نہیں معلوم اس کے بارے میں ہمارے جذباتی لوگوں کا کیا فتویٰ ہوگا۔

ان حوالہ جات کے پیش کرنے کا ایک مقصد تو ان لوگوں کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا ہے جو محلے میں پھٹنے والے چھوٹے سے پٹاخے کو بھی دیوبندیت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ کسی طبقے کی طرف منسوب چند لوگوں کی غلطیوں کو اس پورے حلقۂ فکر کی منسوب کرنا درست نہیں ہوتا، جیسا کہ کسی مسلمان کی غلطی کا ذمہ دار اسلام اور اسلامی تعلیمات کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دوسرے یہ ارشادات ہمارے ان جذباتی لوگوں کے سامنے پیش کرنے مقصود ہیں جن کے ذہنوں میں دیوبندیت بالخصوص حضرت مولانا مدنیؒ کے منہجِ فکر کی ایک عجیب وغریب تصویر بیٹھی ہوئی ہے اور شعلہ بیان خطابتوں اور نعروں کی گھما گھمی میں مطالعہ، مباحثہ اور تبادلۂ آرا کا ماحول نہ ملنے کی وجہ سے وہ تصویر اتنی راسخ ہوگئی ہے کہ اس سے ہٹ کر کسی بات کا تصور ہی ان کے لیے ناقابلِ قبول ہوتا ہے۔ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیجیے، ان بزرگوں کے مذکورہ ارشادات ان کا حوالہ دیے بغیر کسی جذباتی نوجوان کے سامنے پیش کر کے دیکھ لیجیے اس کا کیا ردّعمل ہوتا ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کئی لوگوں کے لیے یہ باور کرنا ہی مشکل ہوجائے کہ جمعیت علماءِ ہند کے اکابر اور حضرت مولانا مدنیؒ جیسے بزرگوں کی زبان وقلم سے عدمِ تشدد، محض صبر اور رجوع الی اللہ پر اکتفا کرنے اور بدامنی پیدا نہ کرنے جیسے الفاظ بھی نکل سکتے ہیں یا اس طرح کے لفظ ان کی ڈکشنری میں موجود بھی ہوسکتے ہیں، اس لیے کہ ہم ان بزرگوں کے نام لینے اور نعرے لگانے جیسے انتہائی ضروری کام میں آج کل اتنے مصروف ہیں کہ ان کے بارے میں مطالعے کی فرصت نہیں ملتی۔

مجھے خود ایک مرتبہ اس طرح کا تجربہ ہوا۔ کسی موضوع پر بات چیت کے دوران میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حوالہ دیا کہ دشمن سے ملاقات یعنی جنگ کی کبھی تمنا نہ کرو، ہاں اگر جنگ ہو ہی جائے تو ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ اس پر ایک اچھے خاصے عالم نے بڑی حیرت بلکہ شاید کسی قدر جذباتی انداز سے پوچھا: ’’کہاں ہے یہ حدیث؟‘‘ میں نے عرض کیا: ’’بخاری میں!‘‘۔ اس پر وہ خاموش تو ہوگئے، لیکن مجھے یہ احساس ہوا شاید ہم لوگوں نے اپنے عظیم نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کی سیرت کا نقشہ ہی کچھ ایسا اپنے لوگوں کے ذہنوں میں بٹھایا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ناممکنات میں سے ہے کہ اللہ کے نبی جنگ کے بارے میں ایسی 'بزدلانہ' بات کہہ سکتے ہیں۔

اوپر چند بزرگوں کے حوالے سے ان کے جو اقوال نقل کیے گئے ہیں، ضروری نہیں کہ ان تمام باتوں سے ان کے معاصر یا ان سے بڑے دوسرے بزرگوں کو اتفاق ہی ہو۔ بعض باتوں سے دیگر اہلِ علم و دانش کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ آج کے بعض جذباتی حلقوں بالخصوص نوجوانوں نے جو راستے اپنے لیے اختیار کیے ہیں، اگر تو وہ انہیں محض اپنی سمجھ بوجھ سے اختیار کیے ہوئے ہیں تو ست بسم اللہ، ہمیں اس مجلس میں ان سے بحث کرنا مقصود نہیں، لیکن چونکہ بہت سے لوگ اسے دیوبندی فکر کا شاخسانہ سمجھ رہے ہیں، اس لیے انہیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ ان امور میں وہ علماء دیوبند کے متبع نہیں ہیں بلکہ اپنا الگ منہجِ فکر رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ واقعی علماءِ دیوبند کی اتباع چاہتے ہیں تو انہیں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ علماء دیوبند میں پائے جانے والے متعدد رجحانات میں سے وہ کس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ بس ان سے اتنی گزارش کریں گے اس رجحان کے بزرگوں کی تعلیمات اور ان کے مزاج و مذاق کو پورے طور پر سمجھنے کی بھی کوشش فرما لیں۔ چونکہ عام طور پر اس طرح کے حضرات کے ذہن میں ہوتا ہے کہ وہ حضرت مدنیؒ اور جمعیت علماء ہند کے اکابر کی پیروی کر رہے ہیں، اس لیے صرف انہی کے فرمودات نقل کرنے کو کافی سمجھا گیا ہے، وگرنہ ان میں سے کئی باتیں دیگر بزرگوں کے حوالے سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ امید ہے کہ ان بزرگوں کے نام سے پیش کی جانے والی یہ باتیں قابلِ غور ضرور سمجھی جائیں گی۔ اسی کے ساتھ دیوبندی حلقے کی قیادت چاہے وہ سیاسی قیادت ہو، مدارس اور وفاق کی قیادت ہو، اساتذۂ کرام ہوں، دینی صحافت سے وابستہ حضرات ہوں، ان پر وقت نے بہت بڑی ذمہ داری عائد کر دی ہے۔ وہ ذمہ داری امریکا، حکومتِ وقت اور موجودہ نظام کو گالیاں دینے کی نہیں۔ یہ کام کتنا ہی مستحسن سہی، اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اپنوں سے اگر کچھ غلطیاں ہو رہی ہوں، ان کے بارے میں ان کی راہ نمائی کرنا مشکل اور صبر و عزیمت کا متقاضی ہے اور اسی کی ایک جھلک حضرت مولانا مدنیؒ کے بعض مکتوبات میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصلحت پسندی کے خول سے نکل کر یہ کام اب دیوبندی قیادت کو کرنا ہی پڑے گا۔ اب تک بھی بہت تاخیر ہو چکی ہے، مزید تاخیر مزید نقصان کا باعث ہوگی۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر دلیل اور ڈھنگ سے بات کی جائے تو رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اپنے حلقوں پر پالیسی امور کو عقیدے اور تقدّس کا درجہ دینے کی بجائے ان پر عام بحث کا ماحول اور ایک متعین نقطۂ نظر سے ہٹی ہوئی کسی بات کو کم از کم سننے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ آج امریکا اور برطانیہ سمیت اتحادی افواج کو افغانستان میں جو ناکامیاں ہو رہی ہیں، ان پر مغرب میں عام بحث ہو رہی ہے، پالیسیوں پر تنقیدیں ہو رہی ہیں، مباحثے ہو رہے ہیں، ناکامیوں کے تذکرے ہو رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ ڈر لگتا ہے کہ یہی کھلا پن شاید مغرب کے لیے سب بڑی طاقت ثابت ہو۔

(بشکریہ ماہنامہ 'الصیانہ' لاہور)